# قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں تہذیبی شعور کی پیش کش

ڈاکٹر رحمت علی شاد
لیکچرار اردو
گورنمنٹ فریدیہ پوسٹ گریجوایٹ کالج، پاک پتن

# CIVILIZATIONAL BACKDROP OF QURA TUL AIN HAIDER'S WRITINGS

Rahmat Ali Shad, PhD
Lecturer in Urdu
Govt. Faridia Post Graduate College, Pakpattan

**Abstract**

Qura Tul Ain holds a unique place in Urdu literature. Her personality and creativity display a wide range of diversity and multidimensionality. She produced four collections of short stories, five novellas and seven novels. Besides this, she tried her creative genius in myriad other genres to establish herself as a genuine writer. Her writings are representative of the spirit of our times as well as our civilization. The tragedy of the disintegration is as palpable in her writing as the search for identity and roots. She has penned the history and civilization in such a way that a holistic picture of our cultural history comes to forth. She laments the loss of our shared heritage throughout her writings.

**Keywords:**

قرۃ العین حیدر، سجاد حیدر یلدرم، نذر زہرا سجاد، کرشن چندر، ڈاکٹر رشید امجد، امجد طفیل، اردو فکشن، آگ کا دریا، برصغیر

اردو فکشن کی عظیم ادیبہ قرۃالعین حیدر کو ایک نابغہ کی حیثیت حاصل ہے۔ان کی تحریروں میں جابجا تہذیبی شعور کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔وہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۸ء کو سید سجاد حیدر یلدرم اور نذر زہرا سجاد کے گھر پیدا ہوئیں۔انھیں ابتدا ہی سے ایسی آسائشیں میسر آئیں جو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتی ہیں۔معاشی خوش حالی، مہذب ماحول، آزادیِ فکر، خاندانی حسب ونسب، بہت ہی خوب صورت مقامات کی سیر، جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے سے میل جول، گھر میں کتب کی بہتات انھیں تو قرۃالعین بننا ہی تھا۔ان کی شخصیت اور ان کے تخیل میں تنوع اور ہمہ جہتی موجود تھی۔انھوں نے پاک وہند ہی نہیں مل کہ فکرِانسانی کو جتنا کچھ دیا وہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

مصنفہ نے چار افسانوی مجموعے ستاروں سے آگے ۱۹۴۷ء، شیشے کے گھر ۱۹۵۴ء، پت جھڑ کی آواز ۱۹۶۶ء اور روشنی کی رفتار ۱۹۸۲ء۔پانچ ناولٹ سیتاہرن ۱۹۶۰ء، چائے کے باغ ۱۹۶۴ء، ہاؤسنگ سوسائٹی ۱۹۶۶ء، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو ۱۹۷۷ء اور دلربا ۱۹۷۶ء اور سات ناول میرے بھی صنم خانے ۱۹۴۹ء، سفینۂ غمِ دل ۱۹۵۲ء، آگ کا دریا ۱۹۵۹ء، آخرِ شب کے ہم سفر ۱۹۷۹ء، کارِ جہاں دراز ہے (تین جلدیں) ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۹ء، ۲۰۰۲ء، گردشِ رنگِ چمن ۱۹۸۷ء اور چاندنی بیگم ۱۹۹۰ء کے علاوہ بچوں کا ادب، تراجم، صحافت نگاری، مصوری، فوٹوگرافی، فلم سازی، موسیقی، خاکہ نگاری، سفرنامے اور رپورتاژ وغیرہ تحریر کر کے اردو زبان وادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔مصنفہ کے تخلیقی ادب نے روحِ عصر کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے یعنی ان کے ہاں تاریخ وتہذیب کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔صدیوں پر محیط اس تاریخی وتہذیبی ارتقا کے سفر میں فطری تبدیلیوں اور تغیرات کے زیرِاثر مختلف تہذیبوں کے خدوخال اور نقوش مسلسل بنتے اور بگڑتے رہے ہیں۔ان کی تحریروں میں مختلف تہذیبوں مثلاً ہندی تہذیب، مسلم تہذیب، مشترکہ تہذیب، مغربی تہذیب اور اینگلوانڈین تہذیب کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے اردو فکشن میں دیومالائی، مذہبی، سائنسی، فلسفیانہ، وقت کی جبریت، شعور کی رو اور تاریخ وتہذیب پر مبنی تصورات پر بحث کی ہے۔ان کے ہاں تخلیق کے اہم محرکات دو عالمی جنگیں، تقسیمِ ہند، محبوب باپ کی وفات کے اثرات اور بیسویں صدی کے عام ذہنی رویے ہیں۔ان کے ہاں مشترکہ تہذیب کے بکھراؤ کے المیے کے ساتھ ساتھ اپنا تشخص اور اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل بھی نظر آتا ہے۔وہ خود لکھتی ہیں:

> ”ہم جہاں رہتے ہیں، جہاں ہماری جڑیں ہیں، ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں وہ خطہ جس نے ہمیں جنم دیا ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔۔۔پریشانی یہ

ہے کہ نئی نسل جو کرشن چندر کا نام بھی سننے کو تیار نہیں اس لیے کہ وہ ہندو ہے اسے اردو کے لسانی اور تمدنی ورثے کے متعلق کیا بتایا جائے گا؟ مستقبل کا پاکستانی ادب کس ورثے کو اپنا گردانے گا"۔(۱)

تاریخ روایاتِ کہن اور نقوشِ پارینہ کا ہی خزینہ نہیں بلکہ ذہنی وفکری، جذباتی وتہذیبی اور معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے۔ برِعظیم کی سرزمین مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایسا مجموعہ رہی ہے جس میں مختلف تہذیبوں کی کش مکش، عروج وزوال، فکری تغیرات اور تبدیلیوں کی بدولت ان کے خدوخال اور نقوش بنتے اور بگڑتے رہے ہیں۔ اپنے وسیع کینوس کی بدولت مصنفہ نے تاریخ وتہذیب کے عروج و زوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ہاں ہمیں تہذیبی شعور کی ایک مکمل تصویر دکھائی دیتی ہے۔ تہذیبی تاریخ کی ابتدا سے لے کر عہدِ حاضر تک انسان مختلف ادوار سے گزر چکا ہے۔ تہذیب وثقافت کا یہ قافلہ بڑھتا رہا اور تاریخ بنتی رہی۔ قرۃ العین حیدر کے فکروفن میں تاریخ اور تہذیب کے متنوع رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا مطالعہ محض ایک عہد یا ایک تہذیب کا مطالعہ نہیں بلکہ کئی عہدوں اور کئی تہذیبوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جڑوں کی تلاش میں مصنفہ نے واقعہ کربلا سے لے کر اب تک ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"قرۃ العین حیدر اپنی جڑوں اور حقیقت کی دوسری جہات اور تہوں کی تلاش کے لیے دل کی مشعل جلا کر وقت کے اندرونی ہفت خواں طے کرتے کرتے ۷۴۰ء کے دمشق میں امام زید بن زین العابدین تک جا پہنچتی ہیں۔"(۲)

مصنفہ کا گھرانہ قدیم وجدید کی آمیزش اور مشرق ومغرب کا حسین سنگم تھا۔ برِعظیم کا تاریخی ورثہ، تاریخی وتہذیبی یگانگت اور وحدت قرۃ العین حیدر کو بہت عزیز تھیں۔ مشترکہ تہذیبی ورثے کی تباہی کا شدید دکھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ برِعظیم کی تاریخ وتہذیب کے ساتھ ان کا جذباتی، ذہنی اور نظریاتی لگاؤ تھا اسی لیے تقسیمِ ہند کو انھوں نے کسی صورت قبول نہیں کیا۔ مصنفہ کے فن میں اعلیٰ تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ اس تخیل کی بدولت بہت اونچا اڑتی تھیں، اس پرواز میں بعض اوقات ایسی منزلیں بھی آجاتی ہیں کہ ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کا تہذیبی وتاریخی شعور اور فنی وفکری تخیل بہت پیچیدہ تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا تصورِ تاریخ وتہذیب اور ان کا فکری کینوس بہت وسیع، جامع اور واضح تھا، اسی لیے انھوں نے اپنے حلقۂ ادب میں وسیع وبلیغ دنیائے فن کو خلق کیا۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں انسانی قدروں اور رشتوں کا زوال اور ہجرتوں کا احوال ہے۔ وہ تقسیم

کے خلاف تھیں کیوں کہ طاقت کے زور پر ہونے والی تقسیم انھیں غیر فطری لگتی تھی وہ اس لیے کہ تقسیم کی آندھی نے اُس تہذیبی تنا ور درخت کو اکھاڑ پھینکا جو لوگوں کو اپنے اسلاف کی زمینوں اور اپنے تہذیبی وثقافتی مراکز سے جوڑے ہوئے تھا،اس طرح سے وہ لوگ اپنی جڑوں سے کٹ گئے۔ان کا تشخص،ان کی زبان،ان کی تہذیب اوران کے کلچر کو تقسیم نے زبردست نقصان پہنچایا،جس سے وراثتیں ایک طرف رہ گئیں اور وارث سرحد کی دوسری طرف چلے گئے۔اس بارے میں پروفیسر رئیس فاطمہ کی رائے ہے:

> ''مشترکہ معاشرت تقسیم کر دی گئی یعنی یہ دونوں ملک آدھے ہیں وراثتیں سرحد کے ایک طرف ہیں اور وارث سرحدوں کی دوسری طرف۔اس نسل کا کیا جرم تھا؟ یہی کہ صدیوں سے ساتھ رہنے کے باوجود تاریخ کے جبر نے انہیں علیحدہ کر دیا تھا۔یہ وہ جڑواں بچے تھے جن کی آنول نال ایک تھی''۔(۳)

قرۃ العین نے وقت کو بنیادی استعارہ بنا کر ہندوستان کی تہذیب و تاریخ کو بیان کیا ہے۔وقت اور فنا کا تصور ان کی بیشتر تحریروں میں موجود ہے۔ان کے نزدیک وقت ایک ظالم اور جابر طاقت ہے جو چیزوں اور چہروں بلکہ جو کچھ بھی اس کی لپیٹ میں آجائے بگاڑ کے رکھ دیتی ہے اسی لیے ان کی تحریروں میں تاریخ بھی زمانی جبر کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں تاریخ جو ظالم اور سفاک ہے وہ وقت کے جلو میں تہذیب کے نقوش بناتی اور بگاڑتی چلی جاتی ہے۔وقت کے سفر کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کے سامنے فرد کی حیثیت ایک تنکے کی سی رہ جاتی ہے۔یعنی ان کے کردار تاریخی جبر کا شکار ہیں۔وقت کے سامنے کوئی رشتے نہیں ہیں۔کوئی منطق،کوئی طاقت وقت پر قابو نہیں رکھ سکتی۔وہ بتاتی ہیں:

> ''گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے۔کبھی کبھی لہریں اسے بہالے جاتی ہیں پھر اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا''۔(۴)

قرۃ العین کے پہلے افسانوی مجموعے''ستاروں سے آگے'' کی کائنات بہت محدود ہے۔اس میں یادیں، رفاقتیں، واہمے،خواب، خیال اور خواہشات کے پنپنے کا عمل نظر آتا ہے۔''میرے بھی صنم خانے'' اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب وثقافت اور تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تہذیبی بحران کا عکاس ہے،جس میں آراستہ وپیراستہ ایوانوں میں صوفوں پر بیٹھے انقلابی مضامین لکھنے والے تعلقہ دار طبقے کی آرزوؤں، امنگوں اور خواہشوں کا المیہ بیان ہوا ہے۔یہ سب کردار اپنی ذات کے جزیروں میں بری طرح قید ہیں اور ان کی ذات کی اسیری انھیں کھل کر اظہارِ محبت تک نہیں کرنے دیتی۔مذکورہ ناول کا اصل موضوع دو تہذیبوں کے مابین کش مکش،تقسیم کا عمل اور فسادات ہیں۔''سفینۂ غمِ دل'' اودھ کے تعلقہ داروں،

جاگیرداروں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی تہذیب وثقافت مصنوعی، کھوکھلی اور ظاہری نمود ونمائش پر مبنی ہے۔مذکورہ ناول ایک کمزور ناول کے طور پر سامنے آتا ہے۔ہم اسے پہلے ناول کی توسیع بھی کہہ سکتے ہیں جس میں سوانحی حالات کا آزادانہ استعمال ہے۔''شیشے کے گھر'' کی کہانیوں میں خواب وخواہشات اور واہموں سے پرے زندگی کی حقیقتیں،فنی بالیدگی،فنی پختگی اور جدید دور کی الجھی ہوئی پیچیدہ دنیا ہے۔

اردو فکشن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والا ناول ''آگ کا دریا'' ہے جو ہندوستانی تہذیبی تاریخ کی ضخیم اور مکمل داستان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فنی شاہکار کا درجہ بھی رکھتا ہے جو اپنے وسیع کینوس کی بدولت اردو زبان کا ایک بڑا ناول گردانا جاتا ہے۔جس کی تعریف میں بھی اور مخالفت میں بھی بے تحاشا لکھا گیا، بہرحال یہ بات تو طے ہے کہ اس ناول سے قبل کی تخلیقات فکری اُٹھان کے ایسے سرچشمے قرار دیے جا سکتے ہیں جو آ کر آگ کے دریا میں شامل ہو جاتے ہیں اور آگ کے دریا میں فن کی موجیں اپنے عروج پر ٹھاٹھیں مارتی اڑھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیبی تاریخ کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔صدیوں پر پھیلی یہ داستان دراصل ایک طویل ذہنی سفر ہے جس کا اصل موضوع وقت اور انسان ہے۔آگ کا دریا کی تفہیم کے لیے ہندوستانی تہذیب کے اس تاریخی سفر کو تین اہم اور بڑے ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔پہلا دور ویدک کال سے شروع ہو کر موریہ خاندان تک آتا ہے جو تاریخی اعتبار سے ہندو دھرم اور بدھ مت کا دور ہے۔اس دور کا نمائندہ گوتم نیلمبر ہے۔دوسرا دور وسطی اور اسلامی دور ہے جو مسلمانوں کی آمد سے لے کر مغلیہ دور کے آخر تک رہتا ہے،جس کا ترجمان ابو المنصور کمال الدین ہے۔ تیسرا دور جدید لکھنو سے تقسیمِ ہند تک آتا ہے۔سرل اشلے اس مشترکہ تہذیب کا نمائندہ ہے۔ان تینوں کرداروں کے متعلق محمود فاروقی کہتے ہیں:

> ''ناول کا تانا بانا تین کرداروں کے اطراف بُنا گیا ہے۔گوتم،کمال اور سرل یہ نام محض تین شخصوں کے نام نہیں بلکہ تین قوموں، تین زبانوں،تین تہذیبوں کے نام ہیں۔ہندو مسلمان اور انگریز''۔(۵)

''سیتا ہرن'' ایک ایسا ناولٹ ہے جو عورت کی بے بسی ، مجبوری اور استحصال کے گرد گھومتا ہے اس میں تاریخی وتہذیبی شعور، یادوں کی صورت میں پنہاں ہے۔اسطوری داستان رامائن میں سیتا کا ہرن راون کرتا ہے بالکل اسی طرح ہندوستانی معاشرے میں عورت کا استحصال مرد کرتے ہیں۔مصنفہ کا یہ ناولٹ اخلاقی ، سیاسی اور سماجی گراوٹ کی ایک عمدہ پیش کش ہے۔''چائے کے باغ'' جس میں دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی نقاب کشائی ملتی ہے۔ایک طرف غریب اور مزدور طبقہ جو مشرقی پاکستان اور آسام کی

سرحد پر چائے کے باغوں میں مزدوری کرتا ہے لیکن تقسیم ہند کے نتیجے میں وہ لوگ بے وطن ہو گئے کیوں کہ پاکستان والے انھیں ہندوستانی اور ہندستان والے انھیں پاکستانی سمجھتے تھے۔دوسری طرف طبقہ امرا ہے جو ہر قسم کی تہذیب اور اخلاقی اقدار سے عاری لوگ تھے۔ان کی زندگیاں تضادات سے بھری ہوئی، لامرکزیت اور روحانی کھوکھلے پن کا شکار نظر آتی ہیں۔دونوں طبقات کے ہاں زندگی کی اصل روح (سکون) کا فقدان نظر آتا ہے۔''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقتصادی اور سماجی صورتِ حال ہے جس میں تہذیب وثقافت کے مٹنے، جاگیردار طبقے کا زوال،نو دولتیے طبقے کا عروج اور سرمایہ دار طبقے کی ضمیر فروشی اور بے حسی کا احوال ہے۔

''دلربا''ناولٹ مٹتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی داستان ہے جس میں ہندوستانی شوبز کی دنیا کے ارتقا وزوال کو بیان کیا گیا ہے۔دلربا کا کردار دونسلوں کے درمیان پُل کا کام کرتا ہے جو ایک طرف زوال پذیر جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری طرف ایک طوائف گلنار کے ساتھ مل کر حمیدہ سے دلربا بن جاتی ہے۔''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو''اودھ کے زوال آمادہ معاشرے میں یہ ہندوستان کی مجبور وبے بس، مفلس اور کچلی ہوئی عورت کی دل دہلا دینے والی داستانِ غم ہے۔یہ ایک بد نصیب کنبے کی کہانی ہے۔اس خاندان نے تلخ زندگی گزاری۔اس تجربے نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا کردی یہاں تک کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔امجد طفیل،ان کے ناولٹوں پر رائے دیتے ہیں:

> ''ان کے ناولٹ دلربا، سیتاہرن، چائے کے باغ اور اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو میں معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں، مروجہ اخلاقی اقدار سے عدم اطمینان، جدید مادی اور صنعتی ترقی کی وجہ سے انسانی دکھوں کے کم نہ ہونے، جدید عورت کے المیے اور تشخص کی تلاش جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا اور آخر میں قرۃ العین حیدر نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان کے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے، یہاں وہ ہمیں وجودی فلسفے سے متاثر نظر آتی ہیں''۔(٦)

''پت جھڑ کی آواز'' میں موجود تنقیدی زاویے مصنفہ کی فکری مثلث وقت،ہجرت اور انسان کو بیان کرتے ہیں جن میں شامل تنہائی، دکھ، کرب، جلا وطنی، انسانی استحصال، عورت کی سماجی حیثیت، مشترکہ تہذیب کا انہدام، سیاسی، معاشی صورتِ حال اور ان سے پیدا ہوتی مجبوریاں ہیں۔مذکورہ افسانوی مجموعے میں فنی استحکام، فنی بالیدگی اور فنی پختگی کا عمل نمایاں ہے۔''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں تاریخ اور وقت کے تناظر میں حیات وکائنات کی فلسفیانہ پیش کش ہے۔یہ بنگال کے ٹورسٹوں کی وہ اندوہ ناک داستان ہے

جو بنگلہ دیش میں عصرِ حاضر کی بے مثال الم ناکی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔انقلابی نظریات اور دہشت پسند تحریکوں سے وابستہ لیڈروں کا بھانڈا پھوڑ کر ان کی اصلیت سامنے لانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ جب تک ان کے پاس کچھ نہ تھا وہ سرمایہ داروں کے خلاف زہر اگلتے رہے لیکن جونہی ان کے حالات تبدیل ہوئے وہ ابن الوقت بن گئے۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' تین جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم سوانحی ناول ۱۲ ویں صدی سے لے کر عہدِ جدید تک کے قرۃ العین کے خاندانی حالات و واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔انھوں نے ان حالات و واقعات کو اس طرح ایک لڑی میں پرویا ہے کہ لڑی کے ایک سرے پر وہ خود موجود ہیں اور دوسرا سرا صدیوں پہلے میدانِ کربلا تک جاتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے خاندان کے تناظر میں صدیوں پر محیط بہ عظیم کی سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ بصورتِ ''کارِ جہاں دراز ہے'' بیان کی ہے۔

''روشنی کی رفتار'' میں شامل افسانوں میں رومانویت سے حقیقت پسندی تک کا یہ سفر موضوعاتی تنوع کے ساتھ مذکورہ کہانیوں کے منظر نامے کو مختلف جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔علمی، تاریخی اور تہذیبی عوامل قرۃ العین کے افسانوں کا خاصہ ہیں۔سابقہ معاشروں کی وہ صورتیں جو ہماری تاریخ و تہذیب اور ثقافت کا حصہ رہی ہیں مگر وقت کی جبریت کی بدولت نئی صورت اختیار کرتی گئیں وہ تمام صورتیں ان کہانیوں میں بہترین انداز میں موجود ہیں۔''گردشِ رنگِ چمن'' ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد معاشرے میں طبقاتی حد بندیاں اس طرح وجود میں آئیں کہ بادشاہ فقیر ہو گئے اور فقیر بادشاہ بن گئے۔سب کچھ تہہ و بالا اور تہس نہس ہو گیا، جس کی زد میں آ کر شریف گھرانوں کی لڑکیاں طوائفیں بننے پر مجبور ہو گئیں۔ اس ناول میں تقدیر کے لکھے اور جبر کو نسل در نسل منتقل ہوتے دکھا کر انسان کو مجبورِ محض اور لاچار ہوتے دکھایا ہے۔تہذیبی تبدیلیوں کے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کی بدولت مذکورہ ناول کا بنیادی موضوع تاریخ و تہذیب ہی ہو سکتا ہے۔اس کہانی کے ذریعے اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش کی ہے۔وقت، تاریخ اور تہذیب کی آمیزش اور اپنے تاریخی شعور کی بدولت انھوں نے کئی نسلوں کی کہانی بیان کی ہے۔''چاندنی بیگم'' میں مصنفہ نے زمین اور اس کی ملکیت کے جھگڑوں کو بنیادی استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔مذکورہ ناول کا بنیادی ڈھانچہ زیادہ منظم اور مربوط نظر نہیں آتا حتیٰ کہ ناول کی ہیروئن چاندنی بیگم بھی اپنے مفعولی کردار کے ساتھ سامنے آتی ہے۔مذکورہ ناول میں اسے مجبور، بے بس اور غریب بنا کر پیش کرنے کا مقصد غریبوں کے ساتھ امرا کے رویوں کو منظرِ عام پر لانا ہے اور دولت کے بغیر انسان کی مجبوری، بے بسی اور بے توقیری کو اُجاگر کرنا ہے۔یہ ناول روایتی اور فارمولا ناول نہیں ہے اس لیے یہ ناول

ہیروئن کے جسمانی وجود کے بغیر ہی محض اس کی یادوں کے ذریعے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ان کے ناولوں کے متعلق ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''قرۃالعین حیدر ایک صاحب اسلوب ناول نگار ہیں۔ان کے ناولوں کے سفر کا آغاز مرے بھی صنم خانے سے ہوا تھا اور یہ ناول اپنی طرز کا ایک نیا تجربہ تھا۔ان کا شاعرانہ اسلوب آگ کا دریا سے ہوتا ہوا گردشِ رنگِ چمن تک اپنی کئی بہاریں دکھاتا ہے۔بنیادی طور پر وہ ایک تخلیقی زبان لکھتی تھیں''۔(۷)

قرۃالعین حیدر ایک ہمہ جہت شخصیت تھیں۔جیسے جیسے ان کی تحریروں کو پڑھتے جائیں ویسے ویسے فکروشعور کے نئے نئے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ان کا کام اتنی وسعت، بوقلمونی اور اتنے پھیلاؤ کا حامل ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔انھوں نے متنوع جہات میں طبع آزمائی کر کے اپنی خلاقانہ ذہنیت کی بدولت اپنے جینوئن رائٹر ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔بہت ساری اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود دنیائے ادب میں بحیثیتِ فکشن نگار ہی ان کا تشخص ابھر کر سامنے آتا ہے۔قرۃالعین حیدر نے بڑے محتاط انداز میں زندگی کی ابدی صداقتوں کی طرف سفر کیا ہے اور وہ سفر جو دھندلکوں،واہموں اور خواب وخواہشات سے شروع ہوا تھا وہ حقیقت اور فنی پختگی کا روپ دھار کر ان کے فکری کینوس کو وسیع تر کرتا دکھائی دیتا ہے۔انھوں نے اپنی ۸۰ سالہ زندگی میں بہترین ادب تخلیق کرتے ہوئے اردو فکشن کے میدان میں تدریجی ارتقا کے حوالے سے کچھ نئی چوٹیاں سر کی ہیں۔ان کے ہاں سماجی آگہی، تاریخی بصیرت اور تہذیبی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کے مطالعے، تخیل اور تاریخ وتہذیب سے وابستگی کے متعلق ڈاکٹر نگہت ریحانہ کہتی ہیں:

''ان کی تاریخی تہذیبی معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ جہاں انہوں نے جدید انسان کو مختلف حیثیتوں سے عصری حقائق زندگی کا ترجمان بنا کر پیش کیا وہیں ان کے بلند پرواز تخیل نے وقت کی دیواریں پھاند کر صدیوں پرانی تاریخ،تہذیب وکلچر کا احاطہ بھی کر لیا۔ان کی فکر رسا یونان،مصر، بابل،چین ایران غرضیکہ مغرب ومشرق،شمال وجنوب سب پر محیط ہے۔وہ اساطیری قصوں، روایات،عقائد،توہمات اور حکایات کے ذریعے ہماری تہذیبی جڑوں کی تلاش کرتی ہیں''۔(۸)

قرۃالعین حیدر نے اپنے منفرد اسلوب کی بدولت اردو فکشن میں موضوعاتی وسعت پیدا کی ہے۔وقت، تاریخ وتہذیب کی آمیزش اور اپنے تاریخی شعور سے انھوں نے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کی کہانی بیان

کی ہے ۔قرۃالعین حیدر کے مطالعے کی وسعت اور مشاہدے کی باریک بینی، ان کے تخلیقی عمل میں شامل ہو کر ان کے اسلوب کو مزید تقویت بخشتی ہے۔ واقعات اور کرداروں کے حوالے سے ایک عہد کو دوسرے عہد سے وہ اس طرح آمیخت کرتی تھیں کہ ان کا یہ فن ان کا منفرد اسلوب بن جاتا ہے۔

ساری زندگی صرف اور صرف ادب کی خدمت کرنے والی اور متعدد اعزازات وانعامات سے نوازی جانے والی قرۃالعین حیدر، آخر کار ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء کی رات ساڑھے تین بجے کیلاش ہاسپٹل نوئیڈا میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں بہت سی علمی وادبی عظیم شخصیات دفن ہیں جن میں مختار احمد انصاری، عابد حسین، صالحہ عابد حسین، غلام السیدین، غلام الثقلین، پروفیسر نورالحسن، بیگم انیس قدوائی، شفیق الرحمن قدوائی، سجاد ظہیر اور رضیہ سجاد ظہیر شامل ہیں۔مصنفہ کو لکھنو کے حسان بن سلیم یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

وہ وجہِ افتخار جہاں سے گزر گئی
فکشن کی تاجدار جہاں سے گزر گئی
حسانؔ جس کے ہاتھوں میں فن کی لگام تھی
وہ فن کی شہسوار جہاں سے گزر گئی(۹)

☆☆☆☆☆

# حوالے


(۱) قرۃالعین حیدر، ''نقوش'' لاہور خاص نمبر دسمبر ۱۹۵۹ء، ص:۲۹۳

(۲) فتح محمد ملک، مضمون ''قرۃالعین، اپنی تلاش میں'' مشمولہ ''قرۃالعین حیدر۔خصوصی مطالعہ'' (مرتبہ) ڈاکٹر عامر سہیل بیکن بکس ملتان ۲۰۰۳ء ص:۵۵۹

(۳) رئیس فاطمہ، پروفیسر، ''قرۃالعین حیدر کے افسانے، ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ'' انجمن ترقی اردو کراچی ۲۰۱۰ء ص:۸۹

(۴) قرۃالعین حیدر، ''آگ کا دریا'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء ص:۲۰۵

(۵) محمود فاروقی۔مضمون ''قرۃالعین حیدر کے دو کردار'' مشمولہ ''قرۃالعین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں'' از حسن ظہیر (مرتبہ) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۲۰۰۷ء ص:۱۴۴

(۶) امجد طفیل، ''قرۃالعین حیدر تشخص کی تلاش میں'' پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء، ص:۹۵

(۷) رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون ''گردشِ رنگِ چمن، ایک جائزہ'' مشمولہ ''قرۃالعین حیدر خصوصی مطالعہ'' (مرتبہ) ڈاکٹر عامر سہیل، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص:۳۷۷

(۸) نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، ''اردو مختصر افسانہ: فنی و فکری مطالعہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نومبر ۱۹۸۶ء ص:۱۱۹

(۹) حسان بن سلیم، نظم بعنوان ''فکشن کا اک سنہرا زمانہ چلا گیا'' مشمولہ ''نیا دور'' قرۃالعین حیدر نمبر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش لکھنو جلد:۶۳، فروری، مارچ ۲۰۰۹ء


✿✿✿